خانقاہ شیخو شریف کی ادبی خدمات کا جائزہ

Muhammad Riaz ul Qadri
MPhil Urdu Scholar, Riphah International University, Faisalabad, Pakistan
Dr Shabbir Ahmad Qadri
Associate Professor, Riphah International University, Faisalabad, Pakistan

Abstract
Khanqah Sheikhu Sharif, Okara, Pakistan stands as one of the most influential spiritual and intellectual centers of the region, distinguished for its enduring contribution to religious scholarship, cultural refinement, and literary advancement. Rooted in a centuries-old Sufi tradition, the Khanqah cultivated an environment where ethical training, spiritual discipline, and knowledge transmission flourished simultaneously. This article examines the historical significance of the Khanqah and highlights its vital role in shaping the literary and cultural landscape of the area. including poetry, Special emphasis is placed on its rich literary heritage produced by devotional writings, historical narratives, and spiritual discourses the scholars and Sufi figures associated with the institution. Through an analytical study, the paper demonstrates how Khanqah Sheikhusharif evolved into a distinctive literary school that integrated spirituality with intellectual creativity, leaving a lasting impact on the literary traditions of the subcontinent. The findings suggest that the Khanqah's multifaceted contributions warrant deeper academic attention and recognition within contemporary literary scholarship.

Keywords:
Khanqah, Sheikhu Sharif, Literary Services, Saut-e-Hadi Analysis,

خانقاہِ شیخو شریف برصغیر کی روحانی و علمی تاریخ میں ایک ایسا روشن سنگِ میل ہے جس نے صدیوں پر محیط عرصے میں علم، تہذیب اور روحانی الہام کے دریچوں کو وا رکھا۔ یہ خانقاہ ایک روحانی مرکز اور ایک ایسا ادارہ ہے جہاں رشد و ہدایت کے ساتھ فکری تربیت اور علمی آراستگی کی روایت پروان چڑھی۔ یہاں کے مشائخ نے اپنے اخلاق، تقویٰ، اور تدریسی مزاج سے اس خطّے میں دینی و علمی شعور کو بیدار کیا اور اسے نئی وسعتیں عطا کیں۔ شیخو شریف کی خانقاہی روایت میں ضبطِ نفس، خدمتِ خلق اور علم دوستی وہ عناصر ہیں جنہوں نے اسے دیگر روحانی مراکز سے ممتاز مقام بخشا۔ شیخو شریف کی ادبی روایت اپنی گہرائی، فکری بالیدگی اور تخلیقی تنوع کے سبب ایک مستقل دبستان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہاں کے مشائخ اور اہلِ قلم نے نعت، منقبت، قصیدہ، تصوف، تاریخ اور نثری ادب میں ایسی مضبوط بنیادیں فراہم کیں جنھوں نے مقامی اور علاقائی ادب کو نئی سمت دی ہے۔ خانقاہ کے مکتوبات، خطبات، تحقیقی رسائل اور شخصی سوانح اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ یہاں ادب کو اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ روحانی تربیت، اخلاقی استحکام اور فکری ارتقا کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ شیخو شریف کا ادبی سرمایہ اپنی انفرادیت اور فکری وقعت کے باعث آج بھی محققین، ادبا اور اہلِ ذوق کے لیے ایک معتبر حوالہ ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اصغر علی بلوچ لکھتے ہیں:

> ”شیخو شریف کی سرزمین نے مراتب اختر اور ناصر شہزاد جیسے شاعروں کو جنم دیا ہے اور روحانی و متصوفانہ روایات کو مستحکم کیا ہے۔ لہلہاتے کھیتوں میں جو خوشبو سب سے زیادہ متاثر کن ہے وہ شیخو شریف کے مزارات پر عود و عنبر اور دیسی گھی کے جلتے چراغوں کی خوشبو ہے جس میں ادب و تصوف کا خوبصورت امتزاج ہے اور ایک عجیب روح پرور سرشاری پائی جاتی ہے۔“(۱)

اس خانوادے کی چند نامور ہستیاں جنہوں نے شعر و ادب کی خدمت میں گراں قدر حصہ لیا، درج ذیل ہیں:

حضرت شیخ محمد غوث گیلانی (پ:۱۴۰۱ء، م:۱۵۱۷ء)

محمد غوث گیلانی سادات شیخو شریف کے جد امجد اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ علم و عرفان کے ساتھ اپنے بلند شعری ذوق کے لیے بھی معروف تھے۔ ان کی دو فارسی تصانیف ''مفتاح الاخلاص'' اور ''دیوان قادری'' ان کے ادبی ذوق اور تخلیقی مہارت کی عکاس ہیں۔ ''مفتاح الاخلاص'' عربی تصنیف ''خلاصۃ المفاخر'' کا منظوم فارسی ترجمہ ہے، جبکہ ''دیوان قادی'' ان کی غزلیات اور ترجیع بند پر مشتمل ہے۔ ان کی شعری عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن جامی جیسی شخصیت انھیں اپنے تصنیف کردہ اشعار بھیجتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی تصنیف ''اخبارالاخیار فی احوال الابرار'' میں ان کے شعری ذوق کے بارے یوں رقمطراز ہیں:

> ''آپ کو شعر گوئی سے بھی رابطہ تھا۔ حضرت غوث اعظم کی شان میں اکثر نظمیں لکھی ہیں آپ کا ایک دیوان بھی ہے۔ قادری تخلص کرتے تھے صاف و سلیس زبان میں ترجیع بند بھی کہے ہیں۔۔۔ کہتے ہیں کہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی آپ کی برتری شعر گوئی کی وجہ سے آپ کی خدمت میں اشعار روانہ کیا کرتے تھے''(۲)

''دیوانِ قادری'' جو علمی اور روحانی ادب کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے، ۲۰۲۱ء میں منگانی شریف ضلع جھنگ سے پیر طاہر حسین قادری کی سرپرستی میں شائع ہوا ہے۔ اس تصنیف کی تصحیحِ متن کی ذمہ داری ڈاکٹر سائرہ خانم نے بڑی دقت نظر اور تحقیقی مہارت سے انجام دی ہے جبکہ اردو ترجمہ اویس عبداللہ منگانوی نے اپنے ادبی ذوق کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ترتیب و تدوین، مقدمہ نویسی، اور ضمیمہ جات کی تیاری کے فرائض پیر طاہر حسین قادری نے نہایت اہتمام اور علمی سلیقے سے انجام دیے ہیں۔ یہ دیوان اردو ادب اور صوفیانہ روایت میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے اور قارئین کے لیے فکر و ادب کا بیش بہا خزینہ فراہم کرتا ہے۔ ''دیوان قادری'' میں شامل ایک غزل ملاحظہ کریں۔

دیدہ از دیدن دیدار تو نوری دارد
چشم مخمور تو از بادہ غروری دارد

گر شود جان بہ خیال تو زخود محو چہ باک
دل آشفتہ ازان وجد حضوری دارد
دولت شادی تو از غم عشقم گفتی
آری آری غم عشق تو سروری دارد
ناصح از عشقتم اگر منع کند عیبی نیست
ظاہر آن است کہ در دیدہ قصوری دارد
ھمہ را روی بہ تست از ھمہ رو دیدستم
آفتاب رخت از ذرہ ظہوری دارد
چند گویی سخن از وعدہ فردا صوفی
نقد امروز دل از وعدہ نقوری دارد
بسر کوی ملامت دل و جان باخت بہ عشق
قادری کی ھوس جنت و حوری دارد
(۳)

سید مجتبیٰ گیلانی المعروف الشیخ فضلیؒ (پ:۱۶۵۷ء،م:۱۷۱۲ء)

حضرت سید مجتبیٰ گیلانی فضلیؒ سلسلۂ گیلانیہ کے ان جلیل القدر اولیائے کرام میں سے ہیں جنھوں نے اپنے علم و عرفان، زہد و ورع اور فیضانِ طریقت سے برصغیر کی روحانی فضا کو منور کیا۔ ان کی ولادت ۱۰۶۸ھ بمطابق ۱۶۵۸ء میں ایک ایسے خانوادۂ مجددین و مشائخ میں ہوئی جو قرونِ متقدمین سے سلسلۂ قادریہ و گیلانیہ کی روحانی امانت کا امین چلا آ رہا تھا۔ انھوں نے طفولیت ہی سے علومِ شریعت و طریقت میں شغف رکھا اور اپنے وقت کے اجلّہ مشائخ و علماء سے کسبِ فیض کیا۔ ان کی حیاتِ طیبہ علم و عرفان، تواضع و انکسار اور تزکیۂ نفس کا حسین مرقع تھی۔ وہ محض سجادہ نشین نہ

تھے بلکہ اہلِ علم و قلم میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ ان کی ذات میں صوفی و عالم، محقق و شاعر، اور مربی و معلم کے اوصاف یکجا تھے۔ ان کا کلام عارفانہ ذوق، دقیق فکری رموز اور روحانی تجربے کی آمیزش سے مزین ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف کے اسرار و معانی پر گہری دسترس رکھتے تھے۔ حضرت فضلیؒ کے مزاج میں ایک خاص توازنِ علم و حال نمایاں تھا۔ ان کے اقوال و اشعار میں عرفانِ ذات اور قربِ حق کے اثرات جابجا محسوس ہوتے ہیں۔ یہی جامعیت انھیں محققینِ تصوف کے ہاں ممتاز کرتی ہے۔ ان کا وصال "شجرۃ الانوار" کے مطابق لاہور میں ۱۱۲۳ھ بمطابق ۱۷۱۲ء کو ہوا۔ تدفین داتا شاہ چراغ لاہوری کے روضہ کے باہر غربی دیوار کے ساتھ ان کے والد سید مصطفیٰ گیلانی کی مرقد کے پہلو میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلسلۂ گیلانیہ علمی و روحانی اعتبار سے اپنے عروج پر تھا اور ان کی ذات اس تسلسل کی درخشندہ کڑی کی حیثیت رکھتی تھی۔ انھوں نے نہ صرف اپنے خانوادے کی روحانی میراث کو محفوظ کیا بلکہ اس میں نئی جہتیں بھی شامل کیں۔ سید مجتبیٰ فضلی گیلانیؒ کی علمی و عرفانی یادگار "عین التصوف" تصوف کی تاریخ میں ایک گراں قدر اور نادر تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ محض ایک تذکرہ نہیں بلکہ تصوف و سلوک، تاریخ و سوانح، اور عرفان و تحقیق کے سنگم سے تشکیل پانے والی ایک ہمہ جہت دستاویز ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے خانوادۂ گیلانیہ کی پہلی اندرونی تحریر ہے جس میں مصنف نے اپنے آباؤ اجداد، شیوخ، ہم مشرب احباب اور ہم عصر صوفیہ کے حالات نہایت سادہ، مگر عالمانہ و محققانہ انداز میں قلم بند کیے ہیں۔

پہلا حصہ تصوف کے اصولی و نظری مباحث پر مشتمل ہے، جہاں مصنف نے سلوک و معرفت، تزکیۂ باطن، ذکر و مراقبہ، طہارتِ قلب، اور منازلِ عرفان جیسے دقیق موضوعات کو نہایت جامع اور واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ دوسرا حصہ ایک تذکرہ نما مجموعہ ہے جس میں مصنف نے اپنے مشائخ و مشاہیر خاندان کے حالات، ہم عصر اولیاء و علما کے احوال، اور اپنے روحانی مشاہدات کو محفوظ کیا ہے۔ اسی حصے میں ان کی آٹھ عرفانی غزلیات اور حضرت سید محمد غوث بالا پیرؒ کے مناقب بھی شامل ہیں، جو کتاب کے روحانی و ادبی حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

یہ نادر مخطوطہ ایک طویل عرصے تک گوشۂ گمنامی میں رہا، یہاں تک کہ اسے پیر محمد طاہر حسین قادری حنفی (منگانی شریف، ضلع جھنگ) نے دریافت کیا۔ چونکہ حضرت سید مجتبیٰ فضلی گیلانیؒ ان کے مشائخ میں شمار ہوتے تھے، اس لیے پیر صاحب نے اس مخطوطے کی تحقیق و تدوین کو اپنی روحانی ذمہ داری سمجھا۔ انھوں نے نہایت عرق ریزی اور علمی دیانت کے ساتھ متن کی ترتیب و تصحیح، مقدمہ نویسی، تعلیقات و حواشی پر کام کیا، اور اس کے علمی پس منظر کو واضح کیا۔ مزید برآں، اس کی اردو ترجمے کا اہتمام کیا گیا جسے کوثر عباس علوی اور اویس عبداللہ منگانوی نے بڑی احتیاط، وفاداری اور فکری باریکی کے ساتھ مکمل کیا۔

ان تمام مساعی کے نتیجے میں ''عین التصوف'' پہلی بار جون ۲۰۱۷ء (۱۴۳۸ھ) میں خانقاہِ منگانی شریف (جھنگ) سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس اشاعت نے نہ صرف ایک تاریخی متروک سرمایہ کا از سرِ نو احیاء کیا بلکہ صوفیانہ ادب کے سرمایہ میں ایک مستند اضافہ بھی کیا۔

پیر طاہر حسین قادری کی علمی بصیرت اور تدوینی محنت کے باعث یہ کتاب آج تاریخِ تصوفِ پنجاب کے معتبر مراجع میں شامل ہو گئی ہے۔ انھوں نے متن کی صحت، اصطلاحات کی تشریح، اور خانوادۂ گیلانیہ کے تاریخی تسلسل کو نہایت تحقیق و توازن کے ساتھ مرتب کیا۔ عین التصوف" محض ایک تصنیف نہیں، بلکہ سلسلۂ گیلانیہ کی روحانی خودنوشت ہے۔ یہ کتاب اس خانوادے کی علمی و باطنی زندگی، فکری ارتقاء اور صوفیانہ روایت کا آئینہ دار ہے۔ مصنف چونکہ خود اس روحانی نظام کے رکن تھے، اس لیے ان کا بیان ایک شہادتِ باطنی کی حیثیت رکھتا ہے جس میں روایت و تجربہ، مشاہدہ و استناد اور علم و عرفان کی مثلث یکجا ہے۔

''عین التصوف'' میں موجود سید مجتبیٰ گیلانی فضلیؒ کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

چو عینک میشود کثرت بہ پیشِ چشمِ نظاراں
نمائد اندر وحدت سراسر جلوہ ای یاراں
چناں نسبت کند پیدا زراہ عشق ھر عاشق

کہ خود معشوق میکرد بنزد فہم عیاراں
چو از شرب صبوحی چشم را گلگو نہ میسازد
ذبیح اللہ میکردند بہ بیش جملہ خونخواراں
زتعبیر حقیقت جملگی لال اند برحق اندً
نفہمد فہم ہر قاصر معما را از اشواراں
محبت را سزاوار است کہ بیحد آفرین گوئم
بمن نمود محبوبی بوجہی رسم غمخواراں
توئی معشوق تو عاشق توئی مطلوب تو طالب
ز فضلیؔ بشنو ایں نکتہ اگر ھستی ز دلداراں
(۴)

سید امام حیدر بخش گیلانی (پ:۱۶۸۸ء،م:۱۷۶۲ء)

سید حیدر بخش، جن کا تخلص حیدر اور حیدر شاہ تھا، علم و ادب اور شعری ذوق کی نمایاں شخصیت تھے، جنہیں حیدر امام کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ علم و فضل اور شعر و شاعری کا ذوق انھیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملا تھا، اور وہ صاحبِ دیوان شاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔ تاہم، لاہور میں سکھا شاہی کے دوران میں یہ علمی ورثہ تباہ ہو گیا۔ سکھ حکمرانوں نے انھیں اپنے درباری امرا میں شامل کرنے کی کوشش کی، تاکہ مسلمانوں کو حکومت سے تعاون پر راضی کیا جاسکے لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی اور لاہور کے تاریخی و مذہبی مقامات کو نشانہ بنایا گیا۔ مقبرہ داتا شاہ چراغ اور اس سے متصل شاہجہانی فن تعمیر کے نادر آرائشی پتھر اور قیمتی نوادرات اکھاڑ لیے گئے۔ ان مظالم کے دوران میں سید حیدر بخش کا نادر دیوان بھی ضائع ہو گیا، جو علمی و ادبی اعتبار سے

ایک قیمتی اثاثہ تھا۔ حضرات گیلانیہ کے معروف مؤرخ سید علی اصغر گیلانی نے ''شجرۃ الانوار''میں اس دیوان کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

''سید حیدر بخش شاہ المشہور حیدر شاہ فقیری بودندہ بوس ودیوان در نظم دارند بعہد تسلط سکھان برلاہور۔'' (۵)

''فقر نامہ''ان کی مشہور تصنیف تصوف کے دقیق و عمیق مباحث پر مشتمل ایک منظوم سی حرفی ہے، جس میں پیچیدہ روحانی مسائل کو شائستگی اور سادگی کے ساتھ اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ مبتدی سالکین کے لیے فقر کی منازل طے کرنا نہایت سہل ہو جاتا ہے۔ اس کے اشعار سلسلہ قادریہ شیخوشریف کے اوراد وظائف میں شامل ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو:

الف۔ اللہ کو ایک کر مانو
ب۔ ترک سبھی سے کریے
ث۔ ثابت کر پاؤں دھریے
ج۔ جلال اسی سے ڈریے
ح۔ حرام کی ڈھونڈ نہ کریے
خ۔ خالی مت یاد سے ہو
د۔ دنیا کو دل سے دھو
ذ۔ ذکر کر اسی کا نت
ر۔ ریا کی نہ کر چت
ز۔ زاری بن بات نہ کریئے
س۔ سراسر عجز موں رہیے

ش۔ شر مت جی پہ ٹھانو
ص۔ صبر کا راہ پہچانو
ض۔ ضمیر پہ شان نہ دھریے
ط۔ طالب بن مان نہ کریئے
ظ۔ ظلم سے بہتا بھاگو
ع۔ عالی درجات کر تیاگو
غ۔ غرور مت عمر پہ کر
ف۔ فنا کو آگے دھر
ق۔ قلب جب کیا پاک
ک۔ کل تب دیکھی خاک
ل۔ لاہوت تبھی پہچانو
م۔۔ ملکوت جب انکا جانو
ن۔ ناسوت سبھی بھلاوے
و۔ وصل تب انکا پاوے
ہ۔ ہادی بن نا ہیں بات
ء۔ ان بن کچھ نہ آوے ہات
ی۔ یقین تو مت کر اور
بن ہادی کے ناہیں ٹھور
حیدر کہی ہے اتنی بات

کسو کسو پائی ان کی گھات

(۶)

سید حسن بخش المعروف حسنین سائیں (پ:۱۷۱۹ء،م:۱۷۸۰ء)

برصغیر کی علمی و روحانی تاریخ میں بعض شخصیات ایسی جلوہ گر ہوتی ہیں جن کے کردار کی خوشبو اور قلم کی روشنی صدیوں کے فاصلے پر بھی محسوس کی جاتی ہے۔ سید حسن بخش المعروف حسنین سائیں انہی درخشندہ شخصیات میں سے تھے۔ ان کا زہد، ان کی بینش، ان کی زبان و قلم سے صادر ہونے والے خیالات اور ان کے فیضِ صحبت سے اُبھرنے والے روشن دل سب مل کر ایک ایسی شخصیت کا نقشہ بناتے ہیں جو اپنے عہد ہی نہیں، آنے والے زمانوں کے لیے بھی چراغِ راہ ثابت ہوئی۔ وہ مردِ حق جن کی محفل درسگاہ اور سکوت تفسیرِ حیات ہوا کرتا تھا۔ ان کے سامنے بیٹھنے کے بعد علم و حکمت کی ایک کہکشاں پھیلتی، اور ان کی گفتگو سننے والا خود کو نئے معنوں کی دنیا میں داخل پاتا۔ ان کے الفاظ میں تاثیر اور جملوں میں حرارتِ ایمان ایسی تھی کہ دلوں کے بند روشن دریچوں میں بدل جاتے۔ وہ قادرالکلام شاعر بھی تھے اور علومِ دینیہ کے ایسے ماہر کہ تفسیر، فقہ اور حدیث کے دقیق مباحث بھی ان کے سامنے گویا کھل کر گفتگو کرتے۔ عربی و فارسی پر ایسی قدرت رکھتے تھے کہ اظہار میں لطافت اور استدلال میں پختگی ان کی تحریر کا امتیاز بن جاتی تھی۔ حسنین سائیں نے محض ملفوظات ہی نہیں چھوڑے، بلکہ ایک قابلِ قدر قلمی ذخیرہ بھی اپنے پیچھے یادگار چھوڑا مگر افسوس کہ ان کا یہ علمی سرمایہ وقت کی گرد اور حالات کی بے دردی میں بکھر گیا۔ اولاد اور عقیدت مندوں نے اسے تبرک جان کر تقسیم تو کر لیا، مگر چراغ کو صراحی میں رکھ دینے کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہی ان کی تصانیف کا ہوا۔ روشنی دب گئی، فائدہ محدود ہو گیا، اور ورق ورق بکھر کر اجنبی ہاتھوں میں چلا گیا۔ اس کے بارے ان کے سوانح نگار سید افضال حسین گیلانی یوں لکھتے ہیں:

> ”آپ نے خاصہ قلمی اور کتابی ذخیرہ اولاد و عقیدت مندوں کیلئے چھوڑا ہے۔ اور ان میں ”سی حرفی“ اور ”جدی کرسی“ کو زیادہ شہرت بھی حاصل ہے۔ یہ الگ

بات ہے کہ یہ ذخیرہ ان ہاتھوں میں ہے جن میں نہ تو خود فائدہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو دینے کی سکت ہے۔چند دریدہ، خستہ اور بھر بھرے اوراق احقر کو تبرکاً اپنے ماموں حاجی سید حسن سے ملے تھے، جن کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ برخوار دار! مجھے تو یہی کچھ اوراق حسنین سائیں کی کتابوں کے اپنے بھائیوں سے تقسیم وراثت کے طور پر تبرکاً ملے۔"(۷)

''یہ ذخیرہ ایسے ہاتھوں میں ہے جن میں نہ خود استفادے کی صلاحیت ہے، نہ کسی اور کو دینے کی سکت۔'' یہ فقرہ صرف ان کے قلمی آثار کی بے قدری نہیں بتاتا بلکہ ہمارے معاشرتی رویے کی بھی گہری تصویر پیش کرتا ہے کہ علم کو وراثت سمجھ کر تقسیم تو کر دیا جاتا ہے مگر اس کے تحفظ کی ذمہ داری نہیں نبھائی جاتی۔ حسنین سائیں کے وہ ملفوظات جو تحریری یا زبانی روایت کے ذریعے محفوظ رہے، ان کے علمی ذوق کی رفعت اور روحانی تجربے کی گہرائی کا آئینہ ہیں۔ ان کے جملوں میں نزاکت بھی تھی اور حکمت بھی، اور ان کے خیالات میں وہ صفائے باطن تھا جو محض الفاظ نہیں، سلوک کے چراغ ہوتے ہیں۔ یہ ملفوظات آج بھی بتاتے ہیں کہ ان کی نظر میں دین اصولوں کا مجموعہ نہیں بلکہ سیرت کا اسلوب ہے، اور علم محض مطالعے کا حاصل نہیں، بصیرت کی بیداری ہے۔ حسنین سائیں صرف عالمِ با عمل اور شاعرِ ذی وقار ہی نہیں تھے، وہ صاحبِ غیرت مجاہد بھی تھے۔ سکھوں کے خلاف جہاد میں انھوں نے نہ صرف عملی حصہ لیا بلکہ اس راہ میں اپنی پوری جائیداد تک چھوڑ دی یہ وہ جذبہ ہے جو مردانِ حق کے خمیر میں شامل ہوتا ہے۔ اسی روح کے ساتھ انھوں نے خانقاہِ شیخوشریف کی بنیاد رکھی، جس نے بعد ازاں علمی و روحانی حیات میں ایک مستقل مرکز کی حیثیت اختیار کرلی۔ ہندوستان میں سلسلہ قادریہ کی تعلیمات کو بدلتے حالات میں پھر سے تازہ کیا، اور علاقے کے عوام کو اسلامی اصولوں، اخلاق اور تربیت سے آگاہ کیا۔ وہ فرنگی محل لکھنؤ کے تربیت یافتہ تھے، اور بانی درسِ نظامی مولوی نظام الدین جیسے جلیل القدر استاد کے فیض یافتہ شاگرد۔ یہی نسبت ان کی علمی گہرائی، فقہی بصیرت اور متانتِ فکر کی بنیاد بنی۔ حسنین سائیں کی شاعری میں صوفیانہ لطافت بھی ہے اور فکری وقار بھی۔ ان کی

نظموں اور اشعار میں کشفِ ذات کا سفر بھی دکھائی دیتا ہے اور عرفانِ الٰہی کی جستجو بھی۔ ان کے اشعار میں فارسی کے رنگ بھی ہیں اور عربی کی صلابت بھی، مگر اس امتزاج میں طبیعت کی روانی اور معنی کی صفائی برقرار رہتی ہے۔

نمونہ کلام پیش خدمت ہے:

حمد

حمد گوئم بے قیاس از جان و دل
آنکہ پیدا کرد آدم راز گل
خلقت ہژدہ ہزار عالم نمود
از عدم نجشید تشریف وجود
(۸)

نعت

اشرف انساں محمد احمد است
ہر دو عالم مست جام از او شد است
رحمت اللعالمین فرمود ، حق
بر سر آدم ازاں دارد سبق
(۹)

ان کے فارسی کلام سے شجرے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایکہ از فیض قدم مکنون اسرار آمدی
باچناں اسمائی حسنٰی خود باظہار آمدی
نقطۂ احمد شدی از تو حسین غائت ظہور
دور محیط فیض عالم ختم پرکار آمدی

بہر حل عقیدہ معنی ز سر جوش کرم
صورت مشکل کشا مولائی مختار آمدی
از پئے ہر تشنہ لب خود ساقی کوثر حسین
خاص از جام شہادت مست سرشار آمدی
(۱۰)

سی حرفی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں ان میں اس وقت کی اردو جو اس خطے میں بولی جاتی تھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

الف۔ اللہ حسنین کا شاہ حیدر پیر
ب۔ بتائی انکو راہ طریق
سید مجتبی شاہ صاحب تحقیق
پ۔ پکڑ نام شاہ محمود
دین و دنیا کہ ان سے ہے مقصود
ت۔ تونگر مصطفیٰ سید پیر
ہادی و مرشد ہیں دستگیر
(۱۱)

سید محمد حسین گیلانی (پ:۱۳۱۵ھ،م:۱۳۷۸ھ)

سید محمد حسین گیلانی مسلم لیگ اور قائداعظم کی ٹیم کے ایک خاموش مگر انتہائی مؤثر مجاہد تھے اور تحریکِ پاکستان کے فکری و تنظیمی محاذ پر بھی ان کی خدمات غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے مہاجرین کی آبادکاری میں جس اخلاص سے عملی کردار ادا کیا وہ ان کی سماجی بصیرت اور ملی احساس کی روشن دلیل

ہے۔ تاہم ان کی اصل پہچان اُن کی ادبی، علمی اور اشاعتی خدمات ہیں، جنہوں نے تاریخِ ادب میں ایک مستقل باب کا اضافہ کیا۔ وہ ''ادارہ صوتِ ہادی شیخوشریف'' کے بانی تھے، ایک ایسا ادارہ جس نے ان کے بعد بھی اردو ادب کو مسلسل نثر اور شاعری کی قیمتی کتب سے مالامال کیا۔ ان کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والا ماہنامہ ''الہادی'' محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک ایسا ادبی و فکری مجلہ تھا جس نے اپنے دور میں علمی، تہذیبی اور دینی مباحث کو وقار، ترتیب اور دلیل کے ساتھ پیش کیا۔ ماہ نامہ ''الہادی'' کے مستقل لکھنے والوں میں ایسے اصحابِ قلم شامل تھے جن کی علمی جہت اور فکری تربیت براہِ راست سید محمد حسین گیلانی سے وابستہ تھی۔ مولانا محمد بخش مسلم بی۔ اے کے مضامین دینی علوم، فقہی مباحث اور ملی مسائل کے حوالے سے ''الہادی'' کا فکری ستون تھے۔ وہ سید محمد حسین گیلانی کے قریبی رفیق اور مشیر تھے، اور ان کی تحریری جہتوں میں گیلانی صاحب کے ذوقِ تحقیق کی جھلک نمایاں رہتی تھی۔ صاحبزادہ پیر فیض الحسن آلومہاروی کے مضامین تصوف، اخلاقیات اور اصلاحِ باطن کے موضوعات پر رسالے کا روحانی رنگ متعین کرتے تھے۔ وہ فکری طور پر سید محمد حسین گیلانی کے نہایت قریب تھے اور خانقاہی روایت کی علمی ترجمانی میں ان کے ہم آواز سمجھے جاتے تھے۔ ابو الفیض منشی علم الدین کے مضامین اوخود سید محمد حسین گیلانی کے اپنے مضامین، ان کے اداریے، تحقیقی نکات، تربیت پر مبنی تحریریں اور عصری مسائل پر مباحث ''الہادی'' کی فکری سمت اور ادبی وقار کا اصل معیار تھے۔ ان کی نثر واضح، متین، تحقیقی اور تربیتی شان کی حامل تھی۔ انھوں نے علمی مکالمے کو سنجیدگی، وقار اور استدلال کے ساتھ نئی سمت عطا کی۔ سید محمد حسین گیلانی کی ادبی خدمات کا محور ''الہادی'' اور بعد ازاں ''ادارہ صوتِ ہادی'' ہے۔ یہ وہ پلیٹ فارم ہے جس نے اردو نثر، مذہبی ادب، تحقیقی روایت اور خانقاہی فکری میراث کو نئی زندگی عطا کی۔ ان کی محنت نے اپنے دور کو بھی متاثر کیا اور آنے والی نسلوں کو بھی ایک مضبوط ادبی سرمایہ فراہم کیا۔

سید مراتب اختر گیلانی (پ:۱۹۳۹ء، م:۱۹۸۸ء)

سید مراتب اختر دبستان شیخوشریف کے وہ ستارے ہیں جنھوں نے کم عمری سے شعر کہنا شروع کیا اور ایک عرصے تک لاہور کے ادبی منظر نامے پر اپنی کرنیں بکھیرتا رہا۔ سجاد باقر رضوی نے اردو ادب میں تخلیقی تحریکات کو

فروغ دینے کے لیے ''ینگ رائٹرز'' کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی جس کے ذریعے نوجوان ادیبوں کے لیے ایک تربیتی پلیٹ فارم مہیا کیا گیا۔ سجاد باقر رضوی کی قیادت میں یہ سوسائٹی ادبی رجحانات کے فروغ کا مرکز بنی، جبکہ مراتب اختر اس انجمن کے سب سے روشن ستارے تھے۔ مراتب اختر کی شاعری جدید غزل میں ایک اہم مقام رکھتی ہے، جہاں انھوں نے روایت اور عصری تقاضوں کو ہم آہنگ کیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی ان کی شاعری اور خصوصاً غزل کے بارے لکھتے ہیں:

> ''مراتب اختر زمانہ طالب علمی میں ہی بہت پختہ گو شاعر تھے۔ وہ مصرعِ ترکے شاعر نہیں تھے۔ لیکن شعر میں اس قدر پختگی، ابلاغ اور کشش تھی کہ سننے والا داد دیئے بغیر نہیں رہتا تھا، مراتب اختر جس طرح خود زندگی سے لبریز تھے ان کی شاعری بھی خلوص، سچائی اور انفاس تازہ سے مالامال تھی۔ وہ غزل لکھتے تھے۔ غزل میں سوچتے تھے اور غزل ہی میں زندہ رہنے کی خواہش رکھتے تھے۔''(۱۲)

غزلوں میں داخلی تجربات اور عصری مسائل کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، جس نے ان کے کلام کو فکری گہرائی اور لسانی تازگی بخشی۔ مجید امجد نے کہا تھا کہ مراتب اختر کے اشعار پر مکاشفوں کا گمان ہوتا ہے اور غزلوں کو نظمینے کہا۔ ان کا تخلیقی طرزِ اظہار اور انفرادیت انہیں اپنے معاصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے کلام میں انفرادی غم اور اجتماعی مسائل کا امتزاج جدید غزل کو ایک نیا افق عطا کرتا ہے۔ انور سدید لکھتے ہیں:

''مراتب اختر نے عروس غزل کو نیا چہرہ دیا تھا، اسی کی غزل سے نئے امکانات ہویدا ہوتے تھے اور اس کی اپنی سرشار کیفیت اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ قاری کو منتقل ہو جاتی تھی۔''(۱۳)

سید مراتب اختر اور مجید امجد اردو ادب کے وہ منفرد شعرا تھے جنہوں نے اپنی شاعری میں روایت اور جدت کو یکجا کیا۔ دونوں شعرا کی ادبی زندگی میں فکری ہم آہنگی کے باوجود، ان کی تقدیر مختلف رہی۔ مجید امجد کو ایک

باصلاحیت نقاد ملا جس نے ان کے کلام کو ادبی حلقوں میں زندہ رکھا، جب کہ مراتب اختر، شہرت سے گریز اور معاصرین کی بے توجہی کے سبب، اپنے حقیقی مقام سے محروم رہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد کراچی میں مقیم ان کے ایک قریبی دوست انوارالحق کی جانب سے ان کا کلام اپنے نام سے شائع کرنا، ادبی بد دیانتی کی خلاف ورزی کی ایک گھناؤنی مثال ہے۔ اب وقت کا تقاضا ہے کہ کوئی مردِ قلندر، کوئی صاحبِ ذوق و صاحبِ جگر اہلِ قلم اٹھے، جو زمانے کی بے حسی اور فراموشی کی دبیز تہوں میں دبے ہوئے ایک عہدِ خلوص کے شاعر، مراتب اختر کے چراغِ فن کو دوبارہ روشن کرے، اور ان کے کلام کو ان کے اپنے نام کے ساتھ شائع کرے۔ یہ ذمہ داری ان کے دوستوں کے لیے تو اب ممکن نہیں رہی۔ سجاد باقر رضوی، امجد اسلام امجد، مجید امجد، افتخار جالب، جعفر شیرازی، گوہر نوشاہی سب کے سب تاریخِ ادب کے اوراق میں امر ہو چکے ہیں، اور جو دو اہلِ نظر باقی ہیں، ڈاکٹر خواجہ زکریا اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری، وہ بھی عمر و علالت کے اس مرحلے پر ہیں جہاں اس علمی امانت کو اٹھانا ان کے لیے دشوار ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ لاہور سے کراچی تک کے تمام ادبی حلقے اس صداقت سے بخوبی واقف ہیں کہ انوارالحق کے نام سے کوئی شاعر تھا ہی نہیں، اور یہ کہ کتاب ''ستارے، ہوا، چراغ'' کی غزل کا ہر شعر، ہر مصرع، ہر بحر، ہر آہنگ، ہر تاثر اور ہر لرزتی صدا اپنے خالق کا نام مراتب اختر کے طور پر پکارتی ہے۔ ساہیوال کے اہلِ قلم اور نقادانِ فن اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ اس مجموعے کا ہر جذبہ، ہر اضطراب، ہر نغمگی مراتب اختر ہی کے تخلیقی وجدان کا مظہر ہے۔ راقم الحروف اس موضوع پر اس لیے خامہ فرسائی کر رہا ہے کہ اس کے سامنے خود سید ناصر شہزاد، سید سید علی ثانی کو بارہا یہ کہتے رہے کہ یہ تمام غزلیں درحقیقت مراتب اختر کی تخلیق ہیں۔ انھی لمحات کی بازگشت آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔ شاید اسی لیے جب راقم نے مراتب اختر کا تعارف قلم بند کیا تو ناصر شہزاد کا وہی درد، وہی کرب، اور ان کے لہجے کی سچائی میری تحریر میں در آئی۔ یہ صرف بیان نہیں بلکہ ایک گواہی ہے۔ اب یہ صرف ایک تنقیدی یا ادبی فریضہ نہیں رہا، بلکہ ادب اور انصاف دونوں کا قرض ہے، کہ مراتب اختر کے نام سے ان کے گم گشتہ فن کو اس کا اصل تعارف لوٹایا جائے۔ یہ عمل نہ صرف ایک شاعر کی روح کے ساتھ انصاف ہو گا بلکہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک سچائی کی بازیافت بھی۔ ضرورت

اس امر کی ہے کہ کوئی صاحبِ درد قلمکار اس فراموش شدہ میراث کو نئی نسل تک پہنچائے، تاکہ مراتب اختر کے لفظوں کی لو پھر سے فروزاں ہو، اور ان کا چراغ ہمیشہ کے لیے ابدیت کی روشنی بن کر جلتا رہے۔ مراتب اختر کی زندگی اور ادبی خدمات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ان کے کام کو تحقیقی بنیادوں پر دوبارہ دریافت کیا جائے اور ان کے کلام کی ادبی اہمیت کو اردو ادب میں مناسب مقام دیا جائے۔ ان کی شخصیت اور شاعری اردو ادب کے ان خاموش گوشوں میں شامل ہیں جہاں فکری بلندی اور تخلیقی انفرادیت کے باوجود مناسب اعتراف نہ ہو سکا۔

مراتب اختر کے شعری مجموعوں میں ''جنگل سے پرے سورج''''حصارِ حال''''گنجِ گفتار'' اور ''گزرا بن برسے بادل'' شائع ہو چکے ہیں۔ پانچواں مجموعہ زیر نظر ہے اوراق منتشر ہیں،

نمونہ کلام:

غزل

یوں نہ اپنوں کی نگاہوں میں پرائے ہوتے
ایک بے درد کی باتوں میں نہ آئے ہوتے
میری صبحوں میری شاموں کی سمن زاروں میں
تو نہ ہوتا تو ترے درد کے سائے ہوتے
اب دلیلوں سے مرے درد کا مداوا نہ کرو
رک گئے تھے تو مرے پاس بھی آئے ہوتے
تم سے گر ہم کو شکایت ہے تو بس اتنی سی
تم نے جو عہد کیے تھے ، وہ نبھائے ہوتے
(۱۴)

غزل

سو چکی جاگتے لمحات کی دنیا بیٹھو
اٹھ کے تم چل بھی دیے۔۔۔ اور ذرا سا بیٹھو
لوگ گھڑ لیتے ہیں افسانے انہیں باتوں کے
بند کمرے میں سر شام نہ تنہا بیٹھو
کس قدر تیز ہوا چلنے لگی ہے باہر
بند کر دو یہ دریچے میرے پاس آ بیٹھو
آو تنہائی کی دیوار سے لگ کر بیٹھیں
پھر نہ چمکے گا یہ گھنگھور اندھیرا بیٹھو
یاد ہے آج بھی وہ رات ،وہ خلوت، وہ ترا
تھام کر ہاتھ مرا پیار سے کہنا بیٹھو
جب بھی اٹھتے ہیں قدم گھر کی طرف رات گئے
دل یہ کہتا ہے وہ آیا کوئی سایا بیٹھو
(۱۵)

سید ناصر شہزاد گیلانی(پ:۱۹۳۷ء،م:۲۰۰۷ء)

ناصر شہزاد مجید امجد کے شاگرد خاص اور قریبی لوگوں میں سے تھے اور مراتب اختر کے ماموں زاد تھے۔ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''چاندنی کی پتیاں''۱۹۶۴ء میں ،دوسرا شعری مجموعہ ''بن باس''۲۰۰۴ءاور تیسرا شعری مجموعہ ''پکارتی رہی بنسی''۲۰۰۸میں چھپا۔ ناصر شہزاد کی نثری تخلیقات میں ''کون دیس گئیوں''(حیاتِ مجید امجد)کے علاوہ خطوط پر مشتمل نسخہ ''خط لکھیں گے''اور دیباچوں کا مجموعہ ''ناصر شہزاد کے دیباچے''قابل ذکر ہیں۔ناصر شہزاد کا شعری شعور اور ذوق اردو غزل کی روایت میں ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعری میں شیخو شریف

کی ادبی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہے، جو ان کے کلام کو ایک منفرد تہذیبی اور روحانی پس منظر عطا کرتی ہے۔ انھوں نے غزل کو محض جمالیاتی تجربے کی بجائے ثقافتی اور روحانی ورثے کی تجسیم بنایا۔ ان کے کلام میں پرانے قصوں، لوک گیتوں، اور علاقائی روایتوں کی بازگشت اس انداز سے سنائی دیتی ہے کہ یہ روایتی غزل کی محدودیت سے آزاد ہو کر ایک نئی دنیا تشکیل دیتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

> ''ناصر شہزاد کے یہاں احساس حسن، تحسین جمال کی حد میں رہتا ہے۔ حسن کے تصور یا تذکرے کے ساتھ کہیں جنسی ہیجان کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ تاہم بعض مقامات پر جنسی احساس کی کچھ نازک لرزشیں محسوس ضرور ہوتی ہیں جو یہ باور کراتی ہیں کہ ان کے یہاں حسن اکائی ہونے کے باوجود ہمہ گیر نہیں ہے۔ یعنی ان کا تصور حسن ارضی ہے اور اس میں مابعد الطبعیی عناصر شامل نہیں ہیں۔ وہ جمال کی ارضیت کو قائم رکھتے اور اسی کو محترم جانتے ہیں، اسے ماورا سے جوڑنے کا اقدام نہیں کرتے، دوسرے لفظوں میں وہ ان رومانیت پسندوں کی مانند نہیں جو ارضی جمال کو بطور علامت لیتے ہیں۔ حسن فطرت کو خالق فطرت کی صفت گردانتے ہیں۔ یوں ایک پیراڈاکس کا شکار ہوتے ہیں، اثبات فطرت میں نفی فطرت کی صورت تلاش کر لیتے ہیں۔ جبکہ ناصر شہزاد ارضی جمال کی اپنی ارضی نہاد کو قائم رکھتے ہیں۔''(۱۶)

ان کے اشعار میں الفاظ زندہ تجربے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جہاں ہر لفظ نہ صرف معنی کی گہرائی کا حامل ہے بلکہ ایک تہذیبی علامت بھی ہے۔ ناصر شہزاد نے اپنی تخلیقی بصیرت سے غزل اور گیتوں کو علاقائی ثقافت کے رنگوں، محبت کی لطافتوں، اور روحانی ادراک کی وسعتوں سے روشناس کیا، جس نے ان کے کلام کو ان کے معاصرین سے ممتاز کیا ہے۔

نمونہ کلام:

پھر لہلہا اٹھا سمے آموں پہ بور کا
جانے سکھی کب آئے مسافر وہ دور کا
اس گاؤں کے نشیب میں بہتی ہے اک ندی
ندی پہ ایک پیڑ جھکا ہے کھجور کا
نیلم سی مرگ نین نگہ دل کے آر پار
جیون کے ارد گرد کرن کنڈ نور کا
اک پل ملاپ پھر کڑے کڑوے کٹھن ویوگ
مقصد تھا بس یہی ترے میرے ظہور کا
پکی سڑک کے داہنے قبریں کنواں وہ گاؤں
گاؤں کی اور چھور سماں سیم تھور کا
کچھ رات اداس کچھ کٹے جنموں جگوں کی پیاس
کچھ تیرے میرے جسم میں سودا فتور کا
یادیں وہ دور دیس وہ گھر اور وہ سامنے
سیمیں بدن سیاہ لباس ایک حور کا
(۱۷)

غزل کے مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

میرے احساس کی قندیل میں ڈھل جاتا ہے
کوئی عالم ہو میری آگ میں جل جاتا ہے

روز آ آ کے خیالوں کے سمن زاروں میں
کوئی مسلے ہوئے پھولوں کو مسل جاتا ہے
رُت پلٹتی ہے تو بچھڑے ہوئے لوگوں کا خیال
عطرِ غم پیرہنِ زیست پہ مل جاتا ہے
زندگی جب بھی کسی شئے کی طلب کرتی ہے
میرے ہونٹوں پہ تیرا نام مچل جاتا ہے
(۱۸)

پھر یوں ہوا کہ مجھ سے وہ یوں ہی بچھڑ گیا
پھر یوں ہوا کہ زیست کے دن یوں ہی کٹ گئے
اخروٹ کھائیں تاپیں انگیٹھی پہ آگ آ
رستے تمام گاوں کے کہرے سے اٹ گئے
(۱۹)

ہم وہ لوگ ہیں جو چاہت میں
جی نہ سکیں تو مر رہتے ہیں
(۲۰)

سید افضال حسین گیلانی(پ:۱۹۴۲ء،م:۲۰۲۰ء)

سید افضال حسین گیلانی، مراتب اختر کے چھوٹے بھائی اور مجید امجد کے شاگردِ خاص تھے۔ ان کے کلام کی ابتدائی اصلاح مراتب اختر نے کی، جبکہ باقاعدہ استاد مجید امجد ہی تھے۔ وہ انھیں دو ہستیوں سے مستنیر تھے البتہ علمِ عروض انھوں نے ڈاکٹر مخدوم غلام جیلانی سے سیکھا۔ انھوں نے نہ تو مشاعرے پڑھے اور نہ شہرت کی طلب رکھی۔

ان کی زندگی گوشہ نشینی میں گزری، جس کے باعث ان کے کلام میں گہرائی اور خلوص نمایاں ہیں۔ سید افضال حسین گیلانی پنجابی شاعری کی بیش تر اصناف میں اپنی فنی مہارت کے لیے معروف ہیں لیکن کافی اور دوہڑہ ان کے خاص میدان شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے خواجہ غلام فرید کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے کافی کی صنف کو سرائیکی زبان سے خالص پنجابی میں منتقل کیا اور اسے اپنے عہد کے فکری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی کافی میں معنوی گہرائی، جذبات کی شدت، اور زبان کی لطافت کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں، سید افضال حسین گیلانی نہ صرف پنجابی زبان کے ایک عمدہ شاعر تھے بلکہ اردو نثر کے میدان میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھیں راست فکر ادیب، عالم دین، مورخ، اور سوانح نگار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کے تحریری کام نے اردو ادب کو انمول خزانے دیے، اور ان کی تحقیقی کاوشیں ان کے علمی کمالات کی گواہ ہیں۔ ان کی شاعری نہ صرف ایک عہد کا ادبی ورثہ ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی مشعلِ راہ ثابت ہو گی۔ احمد راہی جیسے ممتاز شاعر نے ان کے کلام کو پڑھا تو انہیں "خواجہ غلام فرید ثانی" کے لقب سے نوازا۔ ان کی لکھی نعتیں، قصیدے، دوہڑے، اور گیت بہت مقبول ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں:

نثری کتب:

۱۔ ''حیات الامیر'' (دو جلدیں) ۲۔ ''حیات سید سید محمد سائیں'' ۳۔ ''سوانح حیات سید حسن بخش المعروف داتا حسنین سائیں'' ۴۔ ''ہمارے آباو اجداد شیعہ نہ تھے'' ۵۔ ''تصوف کیا ہے؟'' (مقالہ) ۶۔ ''تذکرۃ الابرار''

شعری مجموعے:

۱۔ ''وناں دی چھاں تے سسی'' ۲۔ ''کافی اے یار داویہڑا'' ۳۔ ''عشق، عجیب، طبیب'' ۴۔ ''بدلے رنگ دھریکاں'' ۵۔ ''آہیں + آڑنگ = آہر'' ۶۔ ''کالی چپ''

کلام کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

نعت:

دل وچ شوق ازل دا ــــــ عربی ڈھول مٹھل دا

اوہ ڈنہہ کرماں والا ــــــ شہر مدینیوں شالا
آوے خیر دا ولدا ــــــ عربی ڈھول مٹھل دا

جھگڑے تے سر کر دے ــــــ ہکڑے درد ے بر دے
ہے فیضان عدل دا ــــــ عربی ڈھول مٹھل دا

تاہنگ تہوار نہ بھلدی ــــــ اوجھڑ راہیں رلدی
لبھ لبھ کھوج جمل دا ــــــ عربی ڈھول مٹھل دا

شکر کرے افضال اے ــــــ حال تھیا خوش حال
اے
وٹھڑا مینہہ فضل دا ــــــ عربی ڈھول مٹھل دا
(۲۱)

کافی:

درداں دے قصے میں کہنوں سناواں
مٹھڑی نہ بھاواں بھیناں بھراواں

محرم نہ ملدا۔۔۔ ایہہ دل نہ کھلدا
ہر دم اندیشا ہڈیاں نوں چھلدا
باہجھوں مہانے بیڑا نہ ٹھلدا
پتناں تے بیٹھی روواں ڈھہاواں

اکھیاں نے باہروں ساون وسایا
آہیں نے اندروں آڑنگ بنایا
موجھاں موجھایا، سخناں ستایا
چوڑا نہ چھنکے سنجیاں نے باہواں

افضال تیکوں کیوں پچھدے لوک اے؟
لاون پئے بھنڈیاں، آون پئے ہوکے
رل وسدے سارے مارن ٹوکے
کیہڑے جرم دیاں ملیاں سزاواں
(۲۲)

دوہڑا:

نازک پیر ملوک سسی دے، جنہاں بھار حنا نہ چائے، تھل وچہ آئے
حُسن تے جوبن دے پھل کلیاں، گئے لُو دے وچہ کُرمائے، گئے مر جھائے

کدی تھک کے باندھی کدیں کوک کے اٹھدی کدی ٹُردی پیر لنگا اے۔ آبلہ پا

اے

افضالؔ شہادت بند بند دیسی، جیویں سسی وقت لنگھائے۔ جو سر آئے

(۲۳)

سید سَید علی ثانی گیلانی (پ:۱۹۷۷ء)

سید سِید علی ثانی گیلانی معاصر دور کی اُن علمی شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے بر صغیر میں سلسلۂ قادریہ کی تاریخ، مشائخ کی سوانح اور روحانی روایات کی تحقیق کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ وہ ''ادارہ صوت ہادی'' کے منتظم اعلیٰ اور سید حسن بخش (بانی شیخوشریف) کے علمی و روحانی وارث ہیں۔ اس نسبت نے ان کی علمی کاوشوں کو داخلی بصیرت عطا کی ہے اور انھیں خاندانی روایات تک براہِ راست رسائی کا وہ درجہ نصیب ہوا ہے جو بیرونی محققین کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ ان کا امتیاز صرف نسلی نسبت نہیں، حقیقی امتیاز اُن کی تحقیق، تنقید، تجزیے اور تاریخی مواد کی چھان پھٹک میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے ہمیشہ معروضی طرز کو مقدم رکھا اور ہر روایت کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر پیش کیا ہے۔ یہ وصف انھیں صوفیانہ تذکرہ نگاروں، روایتی مصنفین اور عام مؤرخین سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی کتب کو محققین نے مرجع، مستند اور محققانہ تدوین کے طور پر قبول کیا ہے۔ ان کے قلم میں ادبی نرمی بھی ہے اور تنقیدی سختی بھی، روایت کا احترام بھی اور حقیقت کی تلاش بھی۔ سید سَید علی ثانی جیلانی کی علمی، ادبی اور خانقاہی خدمات بر صغیر کے فکری ورثے کا اہم باب ہیں۔ وہ موثر منتظم، بصیرت افروز معلم، صاحبِ طرز نثر نگار اور اصلاحِ باطن کے علم بردار ہیں۔ ان کی زندگی میں وہ جامعیت پائی جاتی ہے جو ایک طرف روایت کے تسلسل کو مضبوط کرتی ہے اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے فکری تقاضوں کا ادراک بھی فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''ادارہ صوتِ ہادی'' کی تنظیمِ نو ہو یا علمی و تربیتی نشستوں کا اہتمام، دروس و خطبات کا سلسلہ ہو یا مخطوطات کی حفاظت و اشاعت ہر میدان میں ان کی محنت، حکمت اور بصیرت نمایاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے خانقاہی نظام کو رسوم تک محدود نہیں رہنے دیا بلکہ اسے علم، تحقیق، اخلاق اور

خدمتِ خلق کے ایسے مرکز میں تبدیل کیا ہے جو اپنی روحانی حرارت اور علمی سنجیدگی دونوں کے اعتبار سے نمایاں ہے۔ ان کے خطبات میں فکری نظم، تاریخی شعور، صوفیانہ آہنگ اور اصلاحی پیغام ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں، جبکہ تحریروں میں سادگی، شستگی اور تحقیق پر مبنی طرزِ بیان سامنے آتا ہے۔ ان اوصاف نے ان کو اس عہد کے معتبر صوفی، موثر مفکر اور صاحبِ طرز محقق کا درجہ عطا کیا ہے۔ ان کی کتابیں پڑھ کر یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ کتابیں محض مصنف کہلانے کی غرض سے نہیں لکھتے بلکہ ہر وہ موضوع جس پر علمی کمی یا تحقیق کا خلا محسوس ہو، اسی کو اپنی کاوش کا مرکز بناتے ہیں۔ انھی اصولوں کے تحت ان کی تحریریں ظاہری جلوہ آرائی سے بے نیاز، تحقیقی گہرائی اور فکری دیانت پر قائم دکھائی دیتی ہیں۔ برصغیر کی صوفیانہ تاریخ میں اہلِ چشت کی خدمات کا ایک طویل اور روشن سلسلہ موجود ہے۔ ان کے ہاں تصوف، سوانح اور تذکرہ نگاری کا ذخیرہ وافر اور متنوع ہے۔ اس کے برعکس سلسلۂ قادریہ، جو دائرۂ تصوف میں سب سے وسیع تر اور اثر انگیز سلسلہ شمار ہوتا ہے، اپنے علمی و تحقیقی ذخیرے کے اعتبار سے ایک خلا رکھتا ہے۔ اس وسیع سلسلے میں عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعد کوئی ایسی جامع علمی روایت دکھائی نہیں دیتی جو سلسلہ قادریہ کی تاریخ، تعلیمات اور روحانی تسلسل کو منظم صورت میں پیش کرتی ہو۔ یہی وہ کمی ہے جسے سید سید علی ثانی نے باریک بیں تحقیق، تاریخی مطالعے اور منظم تدوین کے ذریعے پورا کیا ہے۔ انھوں نے صرف اَسناد کی فہرستیں جمع نہیں کیں بلکہ پوری تاریخِ قادریت کو ایک مربوط سلسلے کی طرح مرتب کیا ہے، جس میں سوانح، افکار، مشاہدات اور عملی نقشِ قدم سب کچھ باکمال احتیاط سے جمع کیا گیا ہے۔ ان کی تحریروں کا مطالعہ اس حقیقت کو مزید واضح کرتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے کئی وارثانِ سلسلۂ قادریہ کے طرزِ عمل سے بے اطمینانی رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف محض سلسلے کی نسبت یا خاندانی وراثت کا نام نہیں، بلکہ عمل، اخلاق، خدمت اور باطن کی تہذیب سے عبارت ہے۔ اسی لیے ان کی کتابیں محض تاریخ نہیں بلکہ ایک طرح کی اصلاحی دستاویزات بھی ہیں، ایسی تحریریں جو صاحبزادگان اور وارثانِ سلسلہ کو ان کے اسلاف کے کردار کا آئینہ دکھاتی ہیں۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ ''ادارہ صوت ہادی'' کی تنظیم نو ہے، جس کے ذریعے انھوں نے سید محمد حسین گیلانی اور مولانا ظفر علی خان کے مشن کو نہایت مؤثر انداز میں جاری

رکھا ہے۔ سَید علی گیلانی اس وقت ''ادارہ صوت ہادی'' کے منتظمِ اعلیٰ ہیں اور علمی و تحقیقی میدان میں ان کی خدمات کا اعتراف مختلف حلقوں میں کیا جاتا ہے۔ اردو نثر میں ان کے تحقیقی کام نے اہم نقوش چھوڑے ہیں، اور ان کی تصانیف علمی و ادبی دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ ان کی مطبوعات درج ذیل ہیں:

۱۔ ''شجرۃ الاشراف'' ۲۔ ''عقد العقائد'' ۳۔ ''اکمال الافضال فی الاوراد والاشغال'' ۴۔ ''حسب مراتب'' ۵۔ ''انیس المظاہر، سیرت السید عبد القادر جیلانی'' ۶۔ ''رائے احمد خان کھرل شہید'' ۷۔ ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ اور قیام پاکستان میں خانقاہ شیخو شریف کا کردار'' ۸۔ ''سیرت و سوانح حضرت سید عبد الرزاق گیلانی المعروف داتا شاہ چراغ لاہوری'' ۹۔ ''افادات جیلانی'' ۱۰۔ ''تذکرۃ الابرار'' ۱۱۔ ''تذکرۃ الانبیا'' (مترجم) ۱۲۔ ''شہر غزل کے بعد'' ۱۳۔ ''خطبات شیخو شریف'' (دو جلدیں)

ان کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب ''خدا، انسان اور شیطان'' زیرِ طبع ہے، جس سے ان کے فکری اور تحقیقی رجحانات کا علم ہوتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر افتخار شفیع صاحب ان کے مضامین پر مشتمل کتاب ''مقالات جیلانی'' بھی ترتیب دے رہے ہیں۔ سید سید علی گیلانی کی تصانیف ان کے گہرے مطالعے، تحقیق کی باریکیوں سے واقفیت اور تاریخی و دینی موضوعات پر ان کی گرفت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کے کام نے نہ صرف اردو ادب کو مالا مال کیا ہے بلکہ ان کی تحریریں نسلِ نو کے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سید عون الحسن غازی (پ: ۱۹۷۱ء)

سید عون الحسن غازی، معروف شاعر اور ادیب، مراتب اختر کے بھانجے ہیں۔ انہوں نے مراتب اختر پر تحقیقی کتاب ''نقدِ مراتب'' ۲۰۰۴ء میں مرتب کی، جس میں متعدد اہم شخصیات کے مضامین شامل کیے گئے۔ سید عون الحسن غازی کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''سیاہ آسمان'' ۲۰۰۷ء اور دوسرا شعری مجموعہ ''شمائل'' کے نام سے ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔ ایک پنجابی شعری مجموعہ ''ویلے دا پر چھاواں'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ ان کی تخلیقات میں معاصر سیاسی،

سماجی، اور تہذیبی مسائل کا گہرا شعور جھلکتا ہے۔ خانقاہی ماحول اور درویشی فضا نے ان کے فن پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، جو ان کی شاعری میں واضح نظر آتے ہیں۔

نعت کے اشعار ملاحظہ ہوں:

رسول پاک کا ذکر جمال کرتے ہوئے
قلم ،ورق پہ نگوں ہے کمال کرتے ہوئے
لرز سا جاتا ہوں لکھتے ہوئے میں وصف حضور
تمام حد ادب کا خیال کرتے ہوئے
در حضور پہ جھکتا ہے روشنی کے لیے
ہر اک روز کا سورج زوال کرتے ہوئے
ثنا گر شہ عالم ہوں اس لیے غازی
خجل سا ہوگیا فکر مآل کرتے ہوئے
(۲۴)

غزل

ہم سفر میں تھے ' یہی رختِ سفر جانا تھا
دھوپ کو سایہ تو سورج کو شجر جانا تھا
خشک پتوں کو اڑائے لیے پھرتی تھی ہوا
اُن کو اڑنا تھا مگر ہم کو ٹھہر جانا تھا
آگ کا کھیل ضروری تو نہیں ہے کہ ہمیں
لے کے سورج کو ہتھیلی پہ گزر جانا تھا

یوں بکھر کر تری محفل سے نکل آئے تھے ہم
جیسے بہتے ہوئے دریا کو اُتر جانا تھا
اب تصور میں اُسی چھائوں میں بیٹھے ہوئے تھے
ہم نے پیپل کو ترا یاد نگر جانا تھا
اب وہاں دھول سی اڑتی نظر آتی ہے ہمیں
جس کو منزل کے لیے راہ گزر جانا تھا
دیکھ کر اک تری تصویر مری آنکھوں کو
اشک بن کر سرِ قرطاس بکھر جانا تھا
تو نہیں تھا تو مرے رنگِ سماعت نے یہاں
تیری آواز کو جینے کی خبر جانا تھا
وہ تو تنہائی میں میری طرح روتا ہوگا
اور غازیؔ مری آنکھوں ہی کو بھر جانا تھا

(۲۵)

کشمیر

ہر طرف خون ہے

خون ہی خون ہے

جس چمن میں کبھی پھول کھلتے تھے

اور سبز رو کیاریوں میں گل ولالہ ملتے تھے

اب اس چمن زار

شاداب خطے میں
ہر شے لہو رنگ ہے
رات سے بڑھ کے تاریک دن ہے
جہاں سَرد راہیں مہکتی تھیں
اب اس سمن زار وادی میں
بس۔۔۔۔۔راکھ اڑتی ہے
بس۔۔۔۔۔خون بہتا ہے
میں سوچتا ہوں
خدا جانے کب
اس چمن میں بہاریں بسیرا کریں گی!
دہکتی ہوئی رات کو پھر سویرا کریں گی!

(۲۶)

فراق کے زیر عنوان نظم ملاحظہ ہو:

آج قمری مہینے کی چودہ ہے
آج پھر چاند آسمان پر جگمگائے گا
ہاں! یہی تو رات تھی
اس سے بچھڑے جانے کی
ہاں۔۔۔!
آج پھر اس کی یاد میں

دل آنسو بہائے گا(۲۷)

حوالہ جات

(۱)ڈاکٹر اصغر علی بلوچ: مراتب اختر (شخصیت و فن) پر ایک نظر، مضمون مشمولہ: مراتب اختر (شخصیت و فن)، مرتب: مشتاق عادل کاٹھیہ ، مہکاں پبلشر، ساہیوال، ۲۰۱۴ء، ص ۱۲

(۲)عبد الحق دہلوی، محدث دہلوی: ''اخبار الاخیار''، مترجم: مولانا اقبال الدین احمد، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۸۲

(۳)شیخ محمد غوث گیلانی: ''دیوان قادری'' مرتب: طاہر حسین قادری، منگانی شریف، جھنگ، ۲۰۲۱ء، ص ۳۲۶

(۴)سید مجتبیٰ گیلانی فضلی: ''عین التصوف'' مرتب: پیر محمد طاہر حسین قادری، کتابخانہ ابن کرم خانقاہ منگانی شریف، جھنگ، ۲۰۱۷ء، ص ۶۳۔۶۴

(۵)سید اصغر علی گیلانی لاہوری: ''شجرۃ الانوار'' (قلمی نسخہ)، گیلانی لائبریری، شیخوشریف، ص ۱۴۵

(۶)سید افضال حسین گیلانی: ''تذکرۃ الابرار'' مرتب: سید علی ثانی گیلانی، ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۲۵ء، ص، ۷۷۔۷۸

(۷)سید افضال حسین گیلانی: ''سوانح حیات حسن بخش المعروف داتا حسنین سائیں'' ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۶ء، ص ۶۳

(۸)سید افضال حسین گیلانی: ''تذکرۃ الابرار'' مرتب: سید علی ثانی گیلانی، ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۲۵ء، ص ۱۵۱

(۹)ایضاً، ص ۱۴۷

(۱۰)ایضاً، ص ۱۴۳

(۱۱)ایضاً، ص ۱۴۸

(۱۲)ڈاکٹر گوہر نوشاہی: مراتب اختر کی یاد میں، مضمون مشمولہ: نقد مراتب، مرتب: عون الحسن غازی، ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۴ء، ص ۶۵

(۱۳)انور سدید: گنج گفتار، مضمون مشمولہ: نقد مراتب، ص ۵۰

(۱۴)سید مراتب اختر: ''جنگل سے پرے سورج'' ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۷ء، ص ۵۶

(۱۵)ایضاً، ص ۵۶

(۱۶)ڈاکٹر ناصر عباس نیر: بن باس پر ایک نظر، مضمون مشمولہ: سہ ماہی صوت ہادی (ناصر شہزاد نمبر)، شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء، ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۹ء، ص ۴۱

(۱۷)سید ناصر شہزاد: "بن باس" الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۰۳۔۲۰۴

(۱۸)سید ناصر شہزاد: "چاندنی کی پتیاں" مکتبہ ادب جدید، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۹۵

(۱۹)سید ناصر شہزاد: "بن باس" الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۳

(۲۰)ایضاً، ص ۱۰۲

(۲۱)سید افضال حسین گیلانی، سید: "آہیں + آڑنگ = آہر" ادارۂ صوت ہادی، شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۲۰ء، ص ۲۳

(۲۲)ایضاً، ص ۱۳۱

(۲۳)سید افضال حسین گیلانی: "وناں دی چھاں تے سسی"، ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۱۸ء، ص ۱۳۱

(۲۴)سید عون الحسن غازی: "شمائل" ادارہ صوت ہادی، شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۲۰ء، ص ۳۱

(۲۵)سید عون الحسن غازی: "سیاہ آسمان" ادارہ صوت ہادی، شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۷ء، ص ۴۵

(۲۶)ایضاً، ص ۹۳

(۲۷)ایضاً، ص ۲۵

References In Roman

1. Dr Aṣghar ʿAlī Baloch: Marātib Akhtar (Shakhṣiyyat o Fan) Par Ek Naẓar, Maẓmūn Mashmūlah: Marātib Akhtar (Shakhṣiyyat o Fan), Murattib: Mushtāq ʿĀdil Kāṭhīah, Mahikān Pablishar, Sāhīwāl, 2014, p. 12
2. ʿAbd al-Ḥaqq Dihlawī, Muḥaddiṡ Dihlawī: "Akhbār al-Akhyār", Mutarajjim: Maulānā Iqbāl al-Dīn Aḥmad, Dārul Ishāʿat, Karāchī, 1997, p. 282
3. Shaikh Muḥammad Ghauṡ Gīlānī: "Dīwān Qādirī" Murattib: Ṭāhir Ḥusain Qādrī, Mangāṇī Sharīf, Jhang, 2021, p. 326
4. Sayyid Mujtabā Gīlānī Faẓlī: "ʿAin al-Taṣawwuf" Murattib: Pīr Muḥammad Ṭāhir Ḥusain Qādrī, Kitābkhānah Ibn-e Karam Khānqāh Mangāṇī Sharīf, Jhang, 2017, ṣ. 63-64
5. Sayyid Aṣghar ʿAlī Gīlānī Lāhaurī: "Shajrat al-Anwār" (Qalamī Nuskhah), Gīlānī Lā'ibrerī, Shaikho Sharīf, p. 145
6. Sayyid Afẓāl Ḥusain Gīlānī: "Tadhkirat al-Abrār" Murattib: Sayyid ʿAlī Ṡānī Gīlānī, Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2025, p. 77-78
7. Sayyid Afẓāl Ḥusain Gīlānī: "Sawāniḥ Ḥayāt Ḥasan Bakhsh al-Maʿrūf Dātā Ḥasnaīn Sā'īñ" Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2006, p. 63
8. Sayyid Afẓāl Ḥusain Gīlānī: "Tadhkirat al-Abrār" Murattib: Sayyid ʿAlī Ṡānī Gīlānī, Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2025, p. 151

9. Ibid, p. 147
10. Ibid, p. 143
11. Ibid, p. 148
12. Dākṭar Gauhar Naushāhī: Marātib Akhtar Kī Yād Meñ, Maẓmūn Mashmūlah: Naqd-e Marātib, Murattib: ʿAun al-Ḥasan Ghāzī, Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2004, p. 65
13. Anwar Sadīd: Ganj-e Guftār, Maẓmūn Mashmūlah: Naqd-e Marātib, ṣ. 50
14. Sayyid Marātib Akhtar: "Jangal Se Pare Sūraj" Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2007, p. 56
15. Ibid, p. 56
16. Dākṭar Nāṣir ʿAbbās Naiyyar: Ban Bās Par Ek Naẓar, Maẓmūn Mashmūlah: Sehmāhī Ṣaut-e Hādī (Nāṣir Shahzād Number), Shumārah Janwarī tā Mārch 2009, Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2009, p. 41
17. Sayyid Nāṣir Shahzād: "Ban Bās" Alḥamd Pablishanz, Lāhaur, 2004, ṣ. 203-204
18. Sayyid Nāṣir Shahzād: "Chāñdnī Kī Pattiyāñ" Maktabah Adab-e Jadīd, Lāhaur, 1965, p. 95
19. Sayyid Nāṣir Shahzād: "Ban Bās" Alḥamd Pablishanz, Lāhaur, 2004, p. 123
20. Ibid, p. 102
21. Sayyid Afżāl Ḥusain Gīlānī: "Āheñ + Āṛang = Āhar" Idārah Ṣaut-e Hādī, Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2020, p. 23
22. Ibid, p. 131
23. Sayyid Afżāl Ḥusain Gīlānī: "Wanāñ Dī Chhāñ Te Sassī", Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2018, p. 131
24. Sayyid ʿAun al-Ḥasan Ghāzī: "Shamā'il" Idārah Ṣaut-e Hādī, Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2020, p. 31
25. Sayyid ʿAun al-Ḥasan Ghāzī: "Siyāh Āsmān" Idārah Ṣaut-e Hādī, Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2007, p. 45
26. Ibid, p. 93
27. Ibid, p. 25

***